عصری شاعری میں شہری ماحول کی عکاسی

The Reflection of Social Enviornment in Modern Poetry

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ*، ڈاکٹر نادیہ**

Abstract:

Literature cannot be created out of context of a particular environmental. The environment of a writer, some way or the other, influence the writer. There are many facets of an environment. A writer can chose any one or many of these facets for his writings. It depends on a writer as to whether he portrays any one or more of these facets in his writings in an open way or through a garb of similes, symbols and signs. Modern man has invented many things to facilitate a better and easier life but, somehow, human life is restless and nature is going through destruction because of these inventions. People are concerned watching all this, the poets even more so. New poetry has portrayed many other facets of life including the situation of modern cities which have all the pomp and glory but actually are in a state of continuous ruin, many poets have portrayed this in their poems and ghazals. This article concerns poetry which is particularly concerned with the modern environment in the cities.

ادب گرد و پیش اور ماحول سے کٹ کر تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ ماحول اور گرد و پیش کسی نہ کسی صورت تخلیق کار پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہی ہیں۔ ماحول کی بہت سی جہتیں ہیں۔ تخلیق کار کبھی تو اُن سب کو 'اور

* صدرِ شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی

کبھی اُن میں سے صرف ایک جہت کو اپنی تخلیق کے لیے منتخب کرتا ہے۔اب یہ تخلیق کار پر ہے کہ وہ ماحول کی اُن تمام یا اُن میں سے صرف ایک منتخب کی گئی جہت کو تخلیق کے راستے سے مکمل طور پر کھل کر گزارتا ہے یا تشبیہات واستعارات وعلامات واشارات کے پیراہنِ نگین میں چھپا کر۔جدید انسان نے اچھی ،بہتر اور آسان زندگی گزارنے کے لیے جتنی چیزیں ایجاد کی ہیں ان سے انسانی زندگی اور قدرتی ماحول بجائے نکھرنے اور سنورنے کے 'اور زیادہ بے چینی اور تباہی کی طرف جارہے ہیں۔اس دل دوز منظر کو دیکھ کر جہاں اور لوگ غم زدہ ہیں وہیں شاعر بھی اس کرب سے گزر رہے ہیں۔ چنانچہ نئی شاعری میں جہاں زندگی کی اور بہت سی جہات کو پیش کیا جارہا ہے' وہیں اُس میں نئی ایجادات سے بظاہر چمکتے دمکتے اور حقیقت میں تباہ ہوتے شہروں کے ماحول کو بھی بہت سے شاعروں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں پیش کیا ہے۔اس آرٹیکل میں ایسی ہی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں شہری ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: ماحول۔صنعت، شہری زندگی۔سماجی تقاضے۔انقلاب

شاعری کا اصل موضوع حسن وعشق کی باتیں کرنا ہے،ابتدای دور کی شاعری میں واردات عشق، معشوق رقیب اور معشوق کا ذکر کثیر تعداد میں دستیاب ہے۔آہستگی سے اس میں پند ونصیحت اور فلسفہ اور تصوف کی شاندار روایات کا قیام عمل میں آتا گیا۔شعر وشاعری کے وہ پہلو جو انفرادی حیثیت رکھتے تھے ان میں اجتماعیت کا رنگ آتا گیا اور میر کی جانب سے آپ بیتی کو بحیثیت جگ بیتی پیش کیا گیا۔اگر عہد میر سے عہد غالب تک پر نظر دوڑائی جائے تو شعر نگاری خصوصی طور پر غزل نگاری کا قیام اپنی کلاسیکی روایت پر قائم رہا۔مطلب یہ کہ عشق پر مبنی کیفیت کو مختلف انداز میں پیش کیا جاتا رہا۔البتہ ۱۸۵۷ کے بعد اس کے موضوعات میں تبدیلی رونما ہوئی۔حالی نے غزل کو نیا رنگ دیا اور سادگی اصلیت اور جوش کی بنیاد پر اسے حقیقی زندگی کا ترجمان بنادیا اور اس سے قوم کو بیداری کا کام لیا جس کے بعد اس کے موضوعات تبدیل ہونے لگے۔ذہنی وفکری تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ سیاسی وسماجی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔چنانچہ ۱۸۵۷ کے بعد غزل میں سیاسی وسماجی مسائل کی عکاسی کی جانے لگی۔حتیٰ کہ غالب نے عشق کو فلسفیانہ رنگ سمودیا۔بعدازاں اس روایت کا قیام ہوا جس میں موضوع کے طور پر فلسفہ اور تصوف کو جگہ دی گئی۔غالب کے اختتامی دور کو ہی غزل کا جدید دور کہا جاتا ہے۔غالب کی جانب سے غزل نگاری کو فکر اور خیال کی گہرائی دی گئی۔ان کے بعد اس کے اثرات فانی واراصغر کی غزل نگاری میں نمایاں ہوتا ہے۔چونکہ حالی کی جانب سے شعرا کو غزل کی اصلاح کے استعمال سے نئے موضوعات سے آگاہ کردیا گیا تھا۔حالی کی جانب سے جو اصول شعر نگاری

مرتب کیا گیا تھا اقبال نے اس سے بھرپور استفادہ کیا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس میں فکر و خیال کی نئی روح پھونکی جس میں خودی کی شناخت اور عظمت رفتہ کی یاد اور ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کا پیغام تھا۔ حالی نے اردو شاعری میں جس کمی کا شکوہ کیا تھا اقبال نے اپنی شاعری سے اس کمی کو دور کر دکھایا۔ لیکن جدید غزل نگاری کی تشکیل نو اور اس کی احیاء میں اصغر، فنی، جگر اور حسرت کو قابل ذکر مقام ملا۔ ان غزل نگاروں کی جانب سے غزل میں داخلی کیفیات اور واردات قلبی کا اظہار کیا گیا۔ چکبست اور فراق کی جانب سے انسانی زندگی کے کلیدی حقائق کو سامنے رکھا گیا جن میں سماجی اور سیاسی مسائل کی عکس بندی شامل تھی۔ بعد ازاں ترقی پسندوں کی تحریک کے اثر میں شمار کیے جانے والی شاعری کو انقلاب زمانہ میں شامل کیا گیا اور اس میں تحریک آزادی کی گونج، انقلاب زندہ باد کی نعرہ بازی، سرمایہ دارانہ نظام کے مخالفت میں بلند کی گئی آواز، وطن کی محبت کے نغمے، مارکس کے نظریات کے اثرات، اشتراکیت کے نظام کی عکس بندی، عورتوں کے حقوق، مزدور طبقات کی نمائندگی اور نوآبادیات کے نظام کے اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ اس دور میں مجاز، جذبی، فیض، فراق، مخدوم محی الدین وغیرہ نے اس خیال کی کھل کر نمائندگی کی اور غزل کو نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔ نئی شعر نگاری میں داخلی کیفیات کا ذکر دکھائی دیا جس میں فرد کی فرار، اکیلا پن، ذہن کی الجھنیں، بے روزگار ہونا، تقسیم کے اثرات، جنسی مسائل، شہریوں کے مسائل، نئے علاقوں کی تلاش، فرسٹریشن اور اداسی وغیرہ کو بھی شامل بحث کیا جانے لگا۔ جن موضوعات کو جدید شعر نگاری میں شامل کیا گیا ان کا کلیدی مقصد فرد کے وجود کا احاطہ کرنا تھا۔ [1]غزل صرف ہمارا تہذیبی سرمایا ہی نہیں بلکہ اس نے سوتے ہوئے ذہنوں کو بھی جھنجھوڑا ہے۔ بلاشبہ جتنی اہمیت دورِ حاضر میں غزلوں کو دی جارہی ہے اتنی کسی اور صنف کے حصّے میں نظر نہیں آتی۔ اہلِ سخن نے ہر دور میں غزل کے تخلیقی اور معنوی سرمائے میں اضافہ کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ نئے موضوعات کی تلاش نے اردو شاعروں کو اظہار و بیان کے پیمانے تبدیل کرنے پر مجبور کر دیے۔[2] اردو شعر و ادب نے ہر دور میں زندگی کے مسایل کو اپنا موضوع بنایا۔ اکیسویں صدی میں لگاتار سائنس کے میدان میں آئے دن نئی نئی ایجادات اور انکشافات عمل میں آرہے ہیں۔ دورِ حاضر میں ٹکنالوجی ضرورتِ زندگی میں داخل ہو چکی ہے اور زندگی لمحہ لمحہ نئی فکر سے دو چار ہو رہی ہے اور روزانہ سائنس کے میدان میں نئے نئے انکشافات آشکار ہو رہے ہیں تو دور حاضر کو جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا دور کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا۔ یہ وسیع و عریض دنیا آج سائنسی ترقیات کے سبب سکڑ کر انگلی کے اشارے پر آگئی ہے۔ اس جدید دور میں سماج کی ترقی کا دار و مدار سائنس کی ترقی پر منحصر ہے۔ اس بات میں دو رائے نہیں کہ سائنس کی ترقی ہی دراصل معاشرے کی ترقی کی بنیاد ہے۔ اور یہی انسان کو بلندی کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ انسانی شعور کی آبیاری کرتی ہے جس سے تخلیقات و انکشافات کے لئے راہ

ہموار ہوتی ہے۔ سائنس کم و بیش زندگی کے ہر شعبے میں کارفرمائی انجام دیتی ہے، حتیٰ کہ ادب بھی اس سے اچھوتا نہیں، اکثر و بیشتر جب ہم اردو غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو جگہ جگہ ہم کو سائنس پر مبنی اشعار سے آشنائی ہوتی ہے۔

اگر ہم اکیسویں صدی کی اردو غزلوں پر غور کریں تو دیکھتے ہیں کہ دور جدید کی غزلوں میں سائنسی کرامات کی عکاسی موجود ہے۔ بس ہمیں اشعار کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ سائنس کی ترقی نے جہاں بے پناہ سہولتیں فراہم کیں وہیں اس کا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

وہ لوگ جنھوں نے اپنی تجسّس سے پہیہ، ہل اور تیر کمان ایجاد کئے تھے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے لئے میل کا پتھر ثابت ہوئے۔ میڈیکل سائنس کی ترقیوں کے باعث ہی ایسے مہلک امراض کا علاج ممکن ہو پایا جن کو لاعلاج تصوّر کیا جاتا تھا۔ مثلاً انفلوئنزا، ہیضہ، میعادی بخار (ٹائیفائڈ) وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ زراعت کے میدان میں بھی اہم ترقی رونما ہوئیجس کے سبب سبز انقلاب وجود میں آیا۔ آج اگر انسان کی جستجو خوب سے خوب تر چیزوں کی تلاش ہے۔ تو اس کے ساتھ ساتھ ایک ادیب اور شاعر بھی اپنی جستجو میں لگا ہوا ہے کیوں کہ وہ بھی سماج کی ترقی کی راہ ہم وار کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تشبیہات، تلمیحات، حسنِ تعلیل، علامتوں اور استعاروں کے آئینے میں سائنسی فوائد و نقصانات کی ترجمانی کی ہے۔ دراصل شاعر وہی تصویر کشی کرتا ہے جو وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول میں دیکھتا ہے۔ [3]

فضا، پانی اور زمین کی آمیزش سے ہمارا ماحول وجود میں آتا ہے اور بہتر ماحول اسی کو کہا جا سکتا ہے جس ماحول میں قدرتی اور صاف حالت میں یہ تینوں اشیا موجود ہوں۔ اگر کسی کمی یا زیادتی سے کوئی بگاڑ اس ماحولیاتی نظام میں سامنے آئے تو اس کو "ماحولیاتی آلودگی" کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان کی طرف سے اپنے مفاد کے حصول کے لیے قدرت کے معاملات میں مداخلت کی جارہی ہے۔ شہر آباد کرنے اور زراعت اور صنعت کے شعبوں کے قیام کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرنا ماحول کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔ ہرے بھرے علاقوں سے قدرتی حسن ختم کر کے عمارتیں اور فیکٹریاں قائم کی جارھی ہیں جس سے شہر کی فضائیں آلودہ ہوتی جارہی ہیں۔

کوثر صدیقی اس ماحولیاتی آلودگی کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

جنگل سے ہے جیون دھارا
جنگل ہے دنیا کا سہارا
پیڑوں سے ہریالی ملتی
جیون کو خوشحالی ملتی [4]

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقّیوں نے جہاں شہری زندگی کو آسان کیا ہے وہیں اس سے نقصان دہ اثرات بھی

مرتب ہوئے ہیں اور ان منفی اثرات کی وجہ سے ماحول اور اس میں رہنے والے افراد کی صحت شدید متاثر ہو رہی ہے۔ وہ زہریلی گیس جو فیکٹریوں سے برآمد ہوتی ہے اور سڑکوں پر دوڑنے والی گاڑیاں فضا کو آلودہ کرنے کا موجب بنتی ہیں اور کئی بیماریاں اس کو وجہ سے جنم لیتی ہیں اور انسانوں کو متاثر کر رہی ہیں۔

زمینی اوزون کی پرت اس آلودگی سے بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ کلوروفلوروکاربن کی بدولت اوزون کی پرت میں کمیابی مشاہدہ میں آتی ہے اور اس کو وجہ سے صحت کے لیے نقصان دہ شعاعیں سورج سے نکل کل سیدھی زمین پر پڑتی ہیں جن سے جلد کے کینسر جیسے امراض جنم لے رہی ہیں۔ نیز تیزابی بارش نے بھی مضر صحت اثرات پیدا کیے ہیں۔ اس کا وجود بھی ان زہر آلود گیسوں کے بارش کے پانی میں ملنے سے رونما ہوا۔ یہ بارش انسانوں کے ساتھ ساتھ پودوں، سبزیوں اور مچھلیوں کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ انور مسعود نے اپنے پرمزاح انداز میں اس کی یوں منظر کشی کی ہے:

شام تک شام سی رہتی ہے
صبح آتی ہے پر نہیں آتی
بڑھ گیا شہر میں دھواں اتنا
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اردو کی جدید کیا۔ کلاسیکل شاعری کا بھی اگر ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اُن کے تخیل کی نمائندگی کے لیے استعارے جنگل، بیابانوں، باغوں، گلستانوں اور چمنستانوں ہی سے لیے ہوئے ملتے ہیں۔ دیہی علاقوں کے شاعر تو ان استعاروں کو وہاں سے لینے پر مجبور ہوتے ہی ہیں لیکن صورت حال یہ ہے کہ شہروں میں مقیم شعرا بھی اپنے استعارے قدیم معاشروں اور جنگل بیابانوں سے لاتے ہیں، ہنوز یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ ایسے شاعروں کو پہلے جدیدیت والوں نے اور اب مابعد جدیدیت والوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ جو دکھائی دے اُسے لکھو، نیا لکھو، جدید لکھو لیکن ہمارے شاعروں میں سے بہت کم نے ان کی باتوں پر کان دھرے۔ اور بقیہ تمام ابھی تک انہی قدیم استعاروں ہی کو لے کر چل رہے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ یہ جملہ معترضہ ہر گز نہیں ہے۔ قدیم استعاروں میں جو جان، جو طاقت ہے وہ نئے استعاروں، علامتوں میں نہیں ہے۔ قدیم تشبیہات، استعارے، علامتیں اپنے اندر بہت وسعت رکھتی ہیں۔ جبکہ جدید استعاروں میں اس کی کمی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جدید استعاروں سے مملو شاعری سطحی سطحی سی محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ معانی ان سے برآمد نہیں ہو پاتے۔ پھر ایک وجہ اور بھی سامنے آتی ہے کہ اور وہ یہ ہے کہ جدید شاعری سے انبساط و مسرت کم اور جلن زیادہ ملتی ہے۔

جدید شاعری میں کئی قسم کے ماحول اپنا آئینہ دکھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ماحول بھی تو ایک بہت بڑا اور جامع لفظ ہے،اور اصطلاح میں اسے برتیں تو پھر اس کی وسعت میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے،اس طرح پھر اس سے کئی تراکیب جنم لیے لیتی ہیں۔لیکن یہاں سب سے قطع نظر عصری شاعری جن ماحولیات کی عکاس نظر آتی ہے اُس میں کہیں شہری ماحول ہے، کہیں دیہی ماحول، کہیں مذہبی ماحول ہے کہیں سیاسی، کہیں ادبی ماحول ہے، کہیں جنگی۔اور جو سب سے زیادہ ماحول نظر آتا ہے وہ ہے محبت بھرا ماحول، یا پھر نفرت کا ماحول۔سچ پوچھیے تو گرد و پیش میں ان کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔سو شاعر بے چارہ جائے تو کہاں جائے۔اس کے تخیل میں یہ ماحولیات جگہ نہ بنائیں گے تو پھر کون سے ماحول بنائیں گے۔چناچہ اس مقالے میں دیگر تمام ماحولیات کو چھوڑ کر صرف شہری ماحول کو اردو شاعری میں دیکھا گیا ہے۔کہ کس کس طرح شہری ماحول اور زندگی کو شعرا نے اپنے نظموں اور غزلوں میں پیش کیا ہے۔

کاشف رضا کے اب تک دو شاعری کے مجموعے آچکے ہیں۔پہلا مجموعہ "محبت کا محل وقوع"اور دوسرا مجموعہ "ممنوع موسموں کی کتاب" کے نام سے شائع ہوا۔کاشف رضا نے اگرچہ کچھ غزلیں بھی کہیں ہیں لیکن اُن کا زیادہ رجحان نثری نظم کی طرف ہے۔نثری نظموں میں اُنہوں نے عصری مسائل،شہری زندگی،شہری ماحول کو بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔محبت کو ایک نئے انداز سے شہری ماحول میں ڈھال کر لکھی ہوئی اُس کی ایک نظم "نمائش سے ٹاور تک" کو ملاحظہ فرمایئے:

نمائش سے ٹاور تک

ایم اے جناح روڈ پر آتے ہوئے
بائیں ہاتھ کوئی بھی موڑ مڑ کر
مجھ تک پہنچا جا سکتا ہے
درمیان کی تمام گلیوں کو
میں نے اپنے شریانی نظام میں بدل دیا ہے
ہر شریان بالآخر
میرے دل تک پہنچتی ہے
ہزاروں بسیں،کاریں اور رکشے
کاربن پر تمہاری تصویریں کاڑھتے ہیں
اور مجھے بتاتے ہیں
آج تم کہاں کہاں سے گزریں

میرا دل
یہ تمام کاربن جذب کرلیتا ہے
میرے دل، شریانوں
اور تمام چوراہوں کو
بائی پاس کرتے ہوئے
تم ٹاور پہنچ جاتی ہو
نمائش سے ٹاور تک
سولہ چوراہے
تمہیں میری جانب نہیں کھینچ پاتے
میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں(5)

آبادی میں اضافہ اور صنعتوں کے نظام سے ماحولیاتی آلودگی کے ساتھ ساتھ زیر زمین دستیاب پانی اور سمندر کے پانی کے ذخائر بھی متاثر ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اب پینے کے پانی کے مسائل سامنے آرہے ہیں۔اس دنیا میں تقریباً70 فیصد حصہ میں سمندر ہے اس کے باوجود اس سمندر کے پانی کا کھارا ہونے کے سبب اسے پینے کے لیے قابل استعمال نہیں بنایا جاسکتا۔نوید ملک کی جانب سے بڑے ہی منفرد طرز سے پینے کے پانی اور کھارے پانی کے مابین فرق کو واضح کرتے ہوئے اس طرز پر لکھا گیا ہے:

زندگی کیا ہے تمناوں کا کھارا پانی
ہر کوئی پی کے یہاں مانگے دوبارہ پانی(6)

سماجی زبوں حالی، صنعتی ترقی، شہروں کی ہماہمی اور حاکمانہ اقتدار کے سامنے فرد خود کو بے بس، بے چارہ اور تنہا محسوس کرنے لگا ہے جس کا اظہار افتخار عارف نے یوں کیا ہے:

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم میں اپنے ہی شہر میں خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں:

اجنبی ہوں مجھے میرے ہونے کے حالات
اپنے اندروں و بروں کے تضادات کا سامنا ہے
کسی شہرِ دیگر کا باسی ہوں

شاید کے اغوا شدہ ہوں
مگر میں نہیں جانتا
کون بَردہ فروش نے
مٹی کے گل رنگ خوابوں بھرے جھولنے سے
اُٹھایا مجھے
اور میں جن گھروں میں پلا
میں نے دیکھا کہ وہ
میرے جیسے مکینوں سے آباد تھے
اجنبی، گُم شدہ
گھر سے مکتب سے دفتر کا حلقہ نما راستہ
طے شدہ اور پہلے سے آراستہ
قول اقوال، آدرش، اِمثال، آموختے
ان بنے اور بنائے حوالوں میں، اس حال و ماضی میں
کیسے خبر ہو کہ میں کون ہوں!
کس سے پوچھوں کہ اس کے علاوہ کوئی
کوئی راہِ دیگر بھی ہے
فرد۔۔۔افراد کے درمیاں
بس اسی طے شدہ تربیت اور اس کے لوازم کا پابند ہے
حکم و تعمیل میں اک تضاد، اک تصادم کا چلتا ہوا سلسلہ
میری تاریخ ہے (7)

آفتاب اقبال شمیم ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آزاد نظموں کے شاعروں میں وہ ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔ اپنی اس نظم "نئے شہر کا خواب گر" میں شہر کے ماحول کے بیان سے انہوں نے زندگی کے حقیقی روپ کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شہروں میں جس طرح ہر چیز پہلے ہی سے طے شدہ ہوتی ہے۔ اصول وضوابط و قوانین ہوتے ہیں، جن کی پیروی کرنا ہر شہری آدمی پر لازم ہوتی ہے 'اُس سے انحراف کی اجازت کسی کو بھی نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح ہم انسانوں کا جینا اور مرنا بھی سب طے شدہ ہوتا ہے۔ اس کے درمیان کا سفر سب خطِ تقدیر ہوتا ہے۔

کہیں بھی انحراف کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ ناا پنی مرضی سے پیدا ہوئے، اور نہ اپنی مرضی سے اس دنیا کا انتخاب کیا، نہ اپنی مرضی سے اس دنیا کو ہم گزارتے ہیں اور نہ ہی اپنی مرضی سے ہمارا مرنا ہوتا ہے۔ سب طے شدہ ہوتا ہے۔ نظم میں شہری ماحول سے شہری آدمی اُکتا سا جاتا ہے۔ وہی روز کا اُٹھنا اور کام کے لیے مختلف جگہوں کارخانوں، دوکانوں، دفتروں، اسکولوں، کالجوں، منڈیوں میں جانا، اُس کے لیے کچھ نئے معنی، کچھ نئی خوشیاں نہیں رکھتا۔ نہ راستوں میں کچھ تبدیلی ہوتی ہے، نہ گاڑیوں میں۔ آدمی مشین کے ایک پُرزے کی طرح کام کر رہا ہوتا ہے۔ بردہ فروشی کیا ہے یہی کہ غلام کو ایک جگہ سے خرید کر دوسری جگہ بیچ دینا یعنی غلاموں کی تجارت۔ موجودہ سائنسی دور میں بھی یہی تو ہو رہا ہے کہ لوگوں کو مشین سمجھ کر استعمال کیا جا رہا ہے۔ تو جس طرح زیادہ چلتے رہنے کی وجہ سے مشین بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اسی طرح انسان بھی تو تھک جاتا ہے، لیکن جدید شہری ماحول (جس سے دیہی ماحول بھی تباہ ہوتے جا رہے ہیں) نے مشین کو تو آرام کرنے کا وقت دے دیتا ہے 'انسان کو نہیں، چنانچہ وہ صبح سے شام تک کام کر کر کے تھک جانے والا انسان، بغیر آرام مزید کام کرتے ہوئے 'منشیات کو استعمال کرتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کی اگلی نظم دیکھیے:

اس چڑھتی رات کی سردی میں
اُس بند گلی کی نکڑ پر
خفتہ تنّور کے پہلو میں
وہ یار میرا امداد علی سویا ہو گا
اک پُڑیا کی سرشاری میں
کچھ سکھ میں کچھ دشواری میں
کچھ نیند میں کچھ بیداری میں
لیکن۔۔۔ لیکن
شاید وہ اُٹھ کر جا بھی چکا
اک اور الم تصویر ہوا
اب کیا کیجیے
موسم کا جبر بھی شامل ہے
جینے مرنے کی خواری میں
یہ سرما پھر بھی بہتر ہے

تم دیکھو تو
اُس شہر میں کیا کیا برسی ہیں
برساتیں آگ کے ساون کی
کیا جانے کل کی گنتی میں کتنے ہوں گے
جو ڈوب گئے
امریکہ کی بمباری میں (8)

اس نظم میں شہری ماحول (کلچر) کی دین کی طرف واضح اشارے ہیں۔ جہاں اور بہت سے جرائم نے شہروں کو اپنے چنگل میں لے رکھا ہے وہیں منشیات، نشے کی مختلف اقسام نے بھی شہری ماحول کو تباہ کر دیا ہے۔ اس قسم کے چھوٹے موٹے جرائم تو شہروں میں چلتے ہی رہتے ہیں لیکن جنگوں میں بھی دشمن گولا بارود بڑے بڑے شہروں ہی پر پھینکتا ہے۔ یعنی شہری مسائل ہر موسم میں بجائے کم ہونے کے بڑھتے ہی ہیں۔

جن نظموں کے اردو میں ترجمے کیے گئے ہیں، اُن میں بھی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن میں شہری زندگی و ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایڈن رچ کی نظم دیکھیے جس کا ترجمہ کشور ناہید نے کیا ہے:

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
جیسے گراؤنڈ ٹرین کی تیز رفتاری
مندمل ہوتی ہے
اور سیڑھیوں کی جانب بھاگتے ہوئے
اک نئے طرز کے عشق کی جانب
جس کی تمہاری زندگی نے کبھی اجازت نہیں دی
مجھے معلوم ہے تم نظم ٹیلی وژن سکرین کی روشنی میں پڑھ رہے ہو
جہاں بے آواز شکلیں آ جا رہی ہیں
اور تم انتظار کر رہے ہو انتفادہ کی خبر کا
مجھے معلوم ہے تم یہ نظم ایک انتفادہ گاہ میں بیٹھ کر پڑھ رہے ہو
جہاں اجنبیوں سے کہیں آنکھیں ملتی، کہیں
گریزاں رہتی ہیں
مجھے معلوم ہے تم یہ نظم فلاریسینٹ لائٹ میں

پڑھ رہے ہو
کہ نوجوانوں کی بوریت اور تھکاوٹ
کہ جو بہت ہی نو عمری میں
اپنے آپ کو شمار بھی کرتے ہیں اور نہیں بھی کرتے
مجھے معلوم ہے تم نظم پڑھ رہے ہو
کمزور نظر ہونے کے باعث
محدب شیشوں کی مدد سے
پڑھ رہے ہو
ان لفظوں کو وسعت دے رہے ہو
ہر چند مطلب سمجھ میں نہ آئے
تم پڑھے جا رہے ہو
کہ حروف بھی قیمتی ہوتے ہیں
مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
سٹوو پر دودھ گرم کرتے ہوئے
ایک روتا بچہ تمہارے کندھے پر ہے
اور ایک کتاب تمہارے ہاتھ میں ہے
کیونکہ زندگی مختصر ہے
اور تم بھی پیاسے ہو
مجھے پتہ ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
کہ جو تمہاری زبان میں نہیں ہے
کچھ لفظوں کا اندازہ لگاتے ہوئے
باقی کو ایسے ہی پڑھ لیتے ہو
میں جاننا چاہتی ہوں
وہ کونسے لفظ ہیں (9)

اس نظم میں شہری زندگی اور شہری ماحول کو اپنی انتہا پر مصروف دکھایا گیا ہے۔ شہری ماحول دیہی ماحول کی

بنسبت بہت زیادہ تیز رکھتا ہے۔وہاں گرد و پیش کی چیزیں زندگی کو تیز رو کر دیتی ہیں۔ شہر میں زندگی گزارنے والے قاری کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ایک مختصر سے نظم کو بھی ایک نشست میں پڑھ سکے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ شہری ماحول میں آرام اور انبساط و مسرت کے حصول کے لیے بھی انسان کے پاس کوئی وقت نہیں۔

شعرا نے اردو غزل میں شہری ماحول کی عکاسی کے لیے شہر کے استعارے کو اردو غزل میں بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

رئیس فروغ کی نظم "رات بہت ہوا چلی" کا شعر ملاحظہ کیجیے:

چہرے پہچان میں آتے ہیں نہیں
شاہراؤں پہ دھواں ایسا ہے

کاشف حسین غائر نے غزل میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو آزمایا۔غزل میں نظم کی آب و ہوا پیدا کرتے ہوئے انہوں نے شہر کے ماحول پر "شہر نامہ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی:

ورنہ اس شہر میں رہتا ہے کوئی کیا آباد
میرے احباب سلامت میری دنیا آباد
میں بھی اس شہر سے ہو آؤں، اُسے دیکھ آؤں
جس کو رہتا ہے سدا دیکھنے والا آباد
بے زبانی ہے الگ ، اس کی کہانی ہے الگ
وہ جو اک شہر تھا صاحب، لبِ دریا آباد
لاکھ ویران سہی شہرِ محبت لیکن
میں نے اس شہر کو لکھا ہے ہمیشہ آباد
روز کرتا ہوں دعا اپنے کراچی کے لیے
اور اس کے لیے جس نے یہ کیا تھا آباد
مجھ سے پوچھے کوئی اس شہر کی بابت غائر
کتنا ویران ہے اندر سے یہ کتنا آباد

اردو غزل میں شہر کے ماحول کی عکاسی جابجا ملتی ہے:

لوگ اس شہر کو خوشحال سمجھ لیتے ہیں
رات کے وقت بھی جو جاگ رہا ہوتا ہے

(صغیر ملال، اختلاف)

آساں نہیں جاننا اس شہر کا مزاج
سو بار دیکھیے اسے 'سو بار جانیے

(کاشف حسین غائر)

الختصر شہر کے روز افزوں بدلتی ہوئی ٹیکنالوجی و صنعتی تبدیلی نے شہری زندگی کو کس قدر متاثر کیا انھیں کن مسائل کا شکار کیا ان کا عکس ہمیں اردو شاعری میں بخوبی نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مامون عبدالرشید، مابعد جدید غزل کے موضوعات، مشمولہ: تحریک و تنقید، تحریکات و رجحانات، ایشو نمبر22، اردو ریسرچ جرنل،(آن لائن)http://www.urdulinks.com/urj/?p=4123

2۔ منظر ایوب، پروفیسر، اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش، انجمن ترقی اردو پاکستان، ص131

3۔ محمد عادل، اکیسویں صدی کی غزلوں میں سائنس کی عکاسی،

4۔ کوثر صدیقی، جنگل،Rekhta.org

5۔ سید کاشف رضا، ممنوع موسموں کی کتاب، کراچی: شہرزاد، 2021ء، ص50

6۔ نوید ملک، زندگی کیا ہے تمناؤں کا کھارا پانی،Reekhta.org

7۔ اقبال شمیم، سہ ماہی اجراء، کراچی: اپریل تا جون، 2012، ص49

8۔ ایضا

9۔ کشور ناہید، اجراء، کراچی: اپریل تا جون 2012، ص72